# اقبال کی سوانح پر نئی روشنی

[قسط اوّل]

خرم علی شفیق

۲۰۰۳ء میں جب دمادم رواں ہے یمِ زندگی شائع ہوئی تو میرا خیال تھا کہ اقبال کی ابتدائی زندگی سے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ میں نے اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اب بھی یہی خیال ہے مگر اُس کتاب کی اشاعت کے بعد ناظم اقبال اکادمی محمد سہیل عمر کی خاص دلچسپی کی وجہ سے مجھے دائرۂ تحقیق وسیع کرنے کا موقع ملا اور حیاتِ اقبال کے ابتدائی دَور کے بارے میں بعض بالکل نیا مواد اور بعض نئے پہلو سامنے آئے۔ اُن کے اضافے کے ساتھ کتاب نئے عنوان: اقبال: ابتدائی دور، ۱۹۰۴ء تک کے ساتھ جنوری ۲۰۰۹ء میں اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ حیاتِ اقبال میں اس کے بعد کے ادوار پر محیط مزید پانچ کتابوں کی صورت میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا۔

نیا مواد جو اِس کتاب میں متعارف کروایا جا رہا ہے اُن میں سے بعض چیزیں خاص طور پر ماہرین کی توجہ کے لائق ہیں:

۱- قصور کے ایک شاعر کی نظم 'ماں کا خواب' جو ممکن ہے کہ اقبال کو اصل انگریزی نظم کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنی ہو

۲- ''ہستیِ غیر ذی روح'' کے قلمی نام سے لکھا ہوا وہ مضمون جو اقبال کا بھی ہو سکتا ہے

اِس کے علاوہ مندرجہ ذیل پہلوؤں کی طرف اقبال شناسوں نے عام طور پر توجہ نہیں دی تھی جس کی اس کتاب میں تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

۱- بعض نظمیں جو اقبال سے منسوب کی جاتی ہیں اُن کا اقبال کی تصنیف ہونا مشکوک ہے۔ ان میں ہجوِ سعدی، 'عیشِ جوانی'، 'گلِ خزاں دیدہ' اور 'شمعِ زندگانی' شامل ہیں۔

۲- اقبال کی بالکل ابتدائی زندگی کی ایک قلبی واردات جس کا تذکرہ شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۲ء میں ایک مضمون میں کیا اُس پر عموماً کسی نے توجہ نہیں دی (پروفیسر محمد عثمان اور جناب سلیم اختر نے بھی نہیں)!

۳- اقبال اور غالب کے درمیان مماثلت مشہور ہے مگر تصانیفِ اقبال کا غالب کی فارسی مثنویوں کے ساتھ گہرا تعلق دریافت نہیں ہوا

۴- اقبال کی فکر پر قرآن کے اثرات کی بات سبھی کرتے ہیں مگر قرآن کو اقبال کی سوانح کا بنیادی موضوع نہ بنایا گیا اور یہ بھی نہ دیکھا گیا کہ اِسے بنیادی موضوع بنانے سے پوری ذہنی سرگذشت کی صورت بدل جاتی ہے

۵- عموماً سمجھا گیا کہ اقبال پہلے وطنیت کے قائل تھے اور بعد میں ملت کے قائل ہوئے مگر شواہد کی روشنی میں یہ مفروضہ کمزور معلوم ہوتا ہے

۶- اقبال کی بعض متروک نظموں، بالخصوص 'اسلامیہ کالج' اور 'اشکِ خوں' یعنی ملکہ وکٹوریہ کے مرثیے کا اُن کی شاعری کے ارتقا میں حصہ ٹھیک سے نہیں سمجھا گیا

## ماں کا خواب

بانگِ درا حصہ اول میں 'ماں کا خواب' کے ساتھ ذیلی عنوانات 'بچوں کے لیے' اور 'ماخوذ' درج ہیں البتہ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس شاعر سے ماخوذ ہے۔ میرے خیال میں اقبال نے 'ماخوذ' کے ذیل میں صرف اُن شاعروں کے نام درج کیے ہیں جن کے ادبی نصب العین سے انہیں کوئی نسبت ہو مثلاً ٹینی سن، ایمرسن اور لانگ فیلو ورنہ دوسرے شاعروں سے ماخوذ نظموں پر صرف 'ماخوذ' لکھا مگر شاعر کا نام درج نہیں کیا۔ گیان چند نے ابتدائی کلامِ اقبال میں سازِ مغرب کے حوالے سے اسے ولیم بارنس کی نظم 'اے مدرز ڈریم' سے ماخوذ بتایا ہے اور بارنس کی نظم بھی درج کی ہے۔ اب یہ دلچسپ بات میرے سامنے آئی ہے کہ مئی ۱۹۰۳ء کے مخزن میں صفحہ ۴۷-۴۶ پر صدرالدین (از قصور) کی نظم 'ماں کا خواب' شائع ہوئی تھی جو بظاہر ولیم بارنس ہی کی نظم سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔

اقبال کی نظم کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ کب لکھی گئی اور پہلی دفعہ کہاں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں کلیاتِ اقبال مرتبہ عبدالرزاق میں شامل ہوئی اور اسی برس بانگِ درا میں چونکہ حصہ اول کی گیارہویں نظم قرار پائی اِس لیے سمجھنا پڑتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں کہی گئی ہوگی مگر بانگِ درا کی ترتیب میں اقبال نے ہر جگہ زمانی ترتیب کی پابندی نہیں کی جس کی خاص وجہ میں نے اپنے زیرِ اشاعت کتابچے بانگِ درا: ایک تعارف میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال 'ماں کا خواب' کے کچھ متروک اشعار روزگارِ فقیر میں

درج ہیں جو عبدالرزاق کی کلیات میں ہیں نہ بانگِ درا میں، اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم پہلے متروک اشعار کے ساتھ اور پھر اُن کے بغیر شائع ہوئی جسے عبدالرزاق نے کلیاتِ اقبال میں شامل کیا اور بانگِ درا میں بھی یہی ترقی یافتہ متن موجود ہے۔

اب یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے 'ماں کا خواب' صدرالدین کی نظم سے پہلے لکھی جس کی وجہ سے صدرالدین کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی یا صدرالدین کی نظم کی وجہ سے اقبال اس طرف متوجہ ہوئے؟ مزید یہ کہ اقبال نے اصل نظم کی جستجو بھی کی یا صرف صدرالدین کی نظم ہی سے فکر کی کشتیٔ نازک رواں ہوگئی اور اُنھوں نے اسی سے ماخوذ نظم لکھ دی؟ یہ درست ہے کہ صدرالدین کی نظم کا معیار آج پست معلوم ہوتا ہے:

اس تجسس میں شکیل و سلیم
بچے لائن میں کرتے دیکھے عبور
سب کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں روشن
سب کے سب تھے سفید جوں بلور

ایسے اشعار دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ اقبال ان سے ماخوذ نظم نہیں لکھ سکتے لہٰذا اُنھوں نے یہ نظم دیکھ کر ولیم بارنس کے انگریزی متن کی جستجو کی ہوگی (اگر اُن کی نظم پہلے ہی بارنس سے ماخوذ ہو کر نہیں چھپ چکی تھی اور صدرالدین کی نظم خود اقبال کی نظم سے ماخوذ نہیں تھی)۔ دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں: پہلی یہ کہ اُس زمانے میں انگریزی نظموں کے ترجمے میں بڑے بڑے شاعر ٹھوکر کھا رہے تھے اور صدرالدین کی نظم مخزن میں شائع ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اِسے کسی نہ کسی قابل تو سمجھا گیا (مخزن بہرحال معیاری رسالہ تھا)۔ دوسری بات یہ ہے کہ بارنس اور صدرالدین کے معیار میں لاکھ درجوں کا فرق بھی ہو تو اقبال کی نظم دونوں سے اتنی بلند ہے کہ اُس کے مقابلے میں بارنس اور صدرالدین کا باہمی فرق کچھ زیادہ اہم نہیں رہتا:

> انگریزی نظم اور صدرالدین کی نظم سے اقبال کی نظم بالخصوص متروک اشعار کے بغیر بعض بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ انگریزی نظم میں ماں خواب سنانے سے پہلے ہی قارئین کو بتا دیتی ہے کہ اُس کا بچہ مر چکا ہے۔ صدرالدین کی نظم میں بچے کی موت کا تذکرہ خواب کے بیان کے بیچ میں آتا ہے مگر وہاں بھی اس پر اصرار ہے۔ اقبال کی نظم کی ابتدا ہی خواب کے بیان سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ امکان موجود رہتا ہے کہ بچہ سچ مچ میں نہ مرا ہو بلکہ ماں نے صرف خواب میں اُسے مردہ دیکھا ہو۔

یہ فرق اس لحاظ سے اہم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے یہاں روشنی اُس علم کا استعارہ تھا جو انسان کی شخصیت بدل دیتا ہے بلکہ تصوف کی رُو سے ایک طرح کی فنا سے ہم کنار کر کے نئی شخصیت عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کا

ان مراحل سے گزرنا بھی ماں کے خواب میں بچے کی موت کا استعارہ بن سکتا ہے۔ وہ دیا جو بچے کے ہاتھوں میں روشن نہیں تھا وہ کہیں وہی روشنی تو نہیں تھی جس کی دعا 'ایک بچے کی دعا' میں بھی مانگی گئی تھی اور جس کی بدولت 'ہمدردی' میں جگنو نے بلبل کی رہنمائی کی تھی؟ [اقبال: اِبتدائی دَور، ص ۲۵۷]

صدرالدین کی نظم، بارنس کا انگریزی متن اور اقبال کی نظم (اس کے متروک اشعار بھی) میری کتاب میں شامل ہیں۔ امید ہے کہ قارئین موازنہ کر کے رائے قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

## کیا وہ اقبال تھے؟

نومبر ۱۹۰۳ کے مخزن میں ص ۲۸-۱۷ پر ایک طنزیہ مضمون 'مقیاس الروح کا تعلق تصوف کے ساتھ' شائع ہوا جس کے مصنف نے قلمی نام ''ہستی غیر ذی روح'' اختیار کیا تھا۔ مدیر کے نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار وطن میں اسی مصنف کا مضمون 'مقیاس الروح' اخبار وطن، لاہور میں شائع ہو چکا تھا جس میں طنز کیا گیا تھا کہ یورپ کی جدید تحقیقات کی رُو سے رنگ مقیاس الروح ہے یعنی جن اقوام کا رنگ گورا ہے وہ ذی روح ہیں اور رنگدار قوموں کو غیر ذی روح سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمرسن کوئی انگریز تھا جسے کسی ہندوستانی پر گولی چلانے کی پاداش میں انگلستان واپس بھجوایا گیا مگر ہندوستان میں انصاف کے مطالبے نے زور پکڑا تو واپس بلوا کر مقدمہ قائم کیا گیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو ستم ظریف عدالت نے نہ صرف اُسے بے قصور ٹھہرایا بلکہ اُسے نوکری پر بحال کر کے ساقط تنخواہ کی ادائیگی کا حکم بھی جاری کیا۔

اقبال سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے نام سے اس مسئلے پر کچھ نہیں لکھ سکتے تھے مگر مخزن والا مضمون پڑھ کر گمان گزرتا ہے کہ ''ہستی غیر ذی روح'' کے قلمی نام سے یہ مضمون شائد انہی نے لکھا ہو۔ درست ہے کہ یہ قلمی نام اُن کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا مگر یہ ابتدائی زمانہ تھا، مضمون اور نام طنزیہ تھے اور پھر قلمی نام اختیار کرنے کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی تھا کہ مصنف کی شخصیت پردے میں رہے اور آسانی سے ذہن اُس کی طرف منتقل نہ ہو سکے۔

مضمون میں ظاہر کیے گئے خیالات 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' سے جڑے ہوئے ہیں جسے اقبال نے تینتیس برس بعد لکھا۔ اُس میں ابلیس کہتا ہے:

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

مضمون میں شعر درج ہے:

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
جس سے عزّت کو ہے خوف اور جس سے عصمت کو ہے ڈر

دونوں اشعار میں نہ صرف لفظی مناسبت ہے بلکہ مضمون میں یہ شعر ایک حکایت کے ضمن میں درج ہوا ہے جس میں کوئی شخص دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے اور پیچھے اُس کی بیوی بے گھر ہو کر دس سال غربت کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک بدچلن عورت کے مشوروں کے باوجود راستے سے نہیں بھٹکتی۔ آخر فاقوں پر مجبور ہوتی ہے۔

''ایسے عالم میں شیطان محلّہ کی اسی بدچلن عورت کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کو ترغیب دیتا ہے کہ گناہ کر کے اپنی جان کو اس فاقہ کشی کی عذاب دہ موت سے بچائے اور وہ نصیبوں جلی مجبوراً اس پر راضی ہو جاتی ہے۔''

عورت کا شوہر واپس آ کر اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ آخر ایک بزرگ کے آستانے پر حاضر ہوتا ہے تو شرط رکھتے ہیں کہ پہلے کسی چکلے سے ہو کر آئے۔ پہلے بدکتا ہے مگر پھر بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتا ہے تو اتفاق سے وہاں جو عورت ملتی ہے منت سماجت کرتی ہے کہ غربت سے مجبور ہو کر پہلی دفعہ آئی ہے اور پچھتا رہی ہے۔ گھونگھٹ اُلٹ کر دیکھتا ہے تو اپنی بیوی ہے۔ یوں میاں بیوی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور بزرگ کی ہدایت کی مصلحت واضح ہوتی ہے۔ مضمون میں ایمرسن کے قصے کو طنزاً اس حکایت سے مماثل قرار دیا گیا تھا۔

دلچسپ بات ہے کہ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں ابلیس یہ بھی کہتا ہے:

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو

مضمون میں بھی انصاف کے ہندوستانی مطالبے کے حوالے سے درج تھا، ''ایک بڑے جغادری لاٹ پادری کی روح نے جس کو روحوں کی اصطباغ و تطہیر اور ہدایت و تلقین کے مشاغل کی وجہ سے عدم میں بھی چین سے لیٹنے کی فرصت نہ تھی۔ مدراس گورنمنٹ کے گوشِ نصیحت نیوش تک یہ پیغام پہونچا دیا کہ جو کالی ہستی شور و غوغا مچا رہی ہے اُس کو دم دلاسہ دینے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن طرزِ عمل وہی ملحوظ رہے جو شیکسپیئر کی چڑیلوں نے میکبتھ کے متعلق اختیار کیا تھا۔''

اِس مضمون کا 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کے ساتھ تعلق تو صاف ظاہر ہے لیکن اس بات کا بھی قوی امکان پیدا ہوتا ہے کہ اِسے اقبال ہی نے لکھا ہو۔ یہ موضوع مزید تحقیق کے قابل ہے اور اِس سلسلے میں اخبار وطن میں اسی قلمی نام سے شائع ہونے والا مضمون 'مقیاس الروح' بھی تلاش کرنا چاہیے جس کی تاریخِ اشاعت معلوم نہیں مگر مدیرِ مخزن نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ ''حال میں'' شائع ہوا چنانچہ نومبر ۱۹۰۳ء سے کچھ ہی عرصہ قبل شائع ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ۹ اکتوبر کو عدالت کے فیصلے کے فوراً بعد شائع ہوا ہو۔ فی الحال یہ مجھے نہیں مل سکا مگر مخزن والے مضمون کے اقتباسات، اُس کا پس منظر اور تجزیہ میں نے اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ دُوسروں کو مزید تحقیق کی طرف متوجہ کر سکے۔

## مشتبہ نظمیں

کلامِ اقبال کی بعض 'باقیات' کے اولین حوالے موجود نہیں ہیں یعنی ہم عصر رسالہ جس میں وہ شائع ہوں یا اقبال کے اپنے ہاتھ میں لکھے ہوئے متن دستیاب نہیں بلکہ انہیں بعد میں شائع ہونے والے کسی مجموعے سے اخذ کیا گیا ہے۔ ایسی نظموں کو اقبال سے منسوب کرنے میں ہمیشہ شبہے کی گنجائش رہے گی لیکن جب نظم میں کوئی ایسی بات ہو جو اقبال کے فکری ارتقا کے کسی بھی مرحلے سے میل نہ کھاتی ہو تو پھر زیادہ تامل ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے چار نظمیں جنہیں اقبال سے منسوب کیا گیا ہے وہ مشتبہ دکھائی دیتی ہیں:

۱- لدھیانہ کے ایک شاعر سعدی کے خلاف لکھی ہوئی ہجو جو اقبال کے کالج کے زمانے سے منسوب ہے۔

۲- عیشِ جوانی

۳- گلِ خزاں دیدہ

۴- شمعِ زندگانی

پہلی نظم کا ذکر شیخ اعجاز احمد نے مظلوم اقبال (۱۹۸۴) میں کیا۔ اُنھوں نے ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی ایک احمدی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ اُس کتاب میں لکھا تھا کہ لدھیانہ سے سعدی نام کے کوئی صاحب مرزا غلام احمد کے خلاف لکھا کرتے تھے، یہ نظم اُن کی ہجو میں ۱۸۹۴ء میں ایک احمدی اخبار میں شائع ہوئی۔ میں نے کتاب سے نظم تلاش کروا کے دمادم رواں ہے یمِ زندگی کے حواشی میں شامل کی لیکن مزید غور کرنے کے بعد میں مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچا ہوں:

۱۸۹۴ء میں مرزا غلام احمد کی طرف داری کرنے کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ ابھی پچھلے ہی برس اُنھوں نے اپنی کتاب آئینہ کمالاتِ اسلام میں ملکہ وکٹوریہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور پھر امرتسر کے ایک مناظرے میں بڑے دلچسپ انداز میں پادریوں کو نیچا دکھایا تھا جب بعض پادریوں نے کوڑھیوں اور اندھوں کو مرزا صاحب کے پاس بھیجا اور کہلوایا، ''آپ مسیحِ موعود ہیں تو اِنہیں صحیح کر دیں۔'' مرزا صاحب نے مریضوں کو پادریوں کے پاس واپس بھیجتے ہوئے جواب دیا، ''حضرت عیسیٰ کی مسیحائی کا تذکرہ انجیل میں موجود ہے ہمارے قرآن میں نہیں مگر آپ کی انجیل یہ بھی کہتی ہے کہ عیسائیوں کے دل میں اگر سرسوں کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو وہ پہاڑوں کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ اب آپ اِنہیں اپنے ایمان کی قوّت سے تندرست کر دیں۔''

اِس کے باوجود وہ ہجو جسے اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے اقبال کی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کا براہِ راست ماخذ کوئی ہمعصر اخبار نہیں بلکہ بعد میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے۔ اِس میں جو روانی ہے وہ اقبال کی اُس زمانے کی مستند غزلوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی اور جس قسم کا ابتذال ہے اُس کی کوئی اور مثال بھی اقبال کے یہاں نہیں

ملتی بلکہ عجیب سا لگتا ہے کہ ایف اے کے زمانے میں وہ بعض ناگوار تشبیہات سے لبریز نظم کسی ایسے رسالے میں شائع کرواتے جسے اُن کے بزرگوں کی نظر سے گزرنا تھا۔[اقبال: اِبتدائی دَور، ص۱۰۶-۱۰۷]

پوری نظم میں نے کتاب کے حواشی میں رہنے دی ہے اور ص۳۳۱-۳۲۹ پر دیکھی جا سکتی ہے تا کہ قارئین خود فیصلہ کر سکیں۔

بقیہ تینوں نظمیں گیان چند نے ابتدائی کلامِ اقبال (۱۹۸۷) میں شامل کیں جہاں سے میں نے بھی انہیں دمادم رواں ہے یمِ زندگی میں اور صابر کلوروی نے بھی کلیاتِ باقیاتِ اقبال میں شامل کیا۔ اب میں نے حواشی میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

یہ تینوں نظمیں گیان چند (۱۹۸۸) ص۸۸-۸۳ پر موجود ہیں۔ 'عیشِ جوانی' ۴۵ اشعار کا قطعہ ہے جس میں شاعر نے گزری ہوئی جوانی کو یاد کرتے ہوئے وصال کے لمحات کا نقشہ کھینچا ہے اور ''بوس و کنار'' کے قافیے کو اتنی بار استعمال کیا ہے کہ بیزاری ہونے لگتی ہے۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اب بوڑھا ہو چکا ہے اور ناتوانی سے کروٹ بدلنا بھی ناگوار ہے۔ اِس کے بارے میں خود گیان چند نے خیال ظاہر کیا ہے، ''اقبال سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے...لیکن 'درایامِ جوانی چناں کہ اُفتد دانی' والا معاملہ ہے۔'' اُنھوں نے کسی سَند کے بغیر اِسے اقبال کی نظم تین بنیادوں پر مان لیا ہے: پہلی یہ کہ اقبال نے ایک اور متروک قطعے 'ہم نچوڑیں گے دامن' میں بھی عورت کے سراپے کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ موقف تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اقبال کی شاعری میں بھی جنس کا اثر جھلکا ہو گا اور ایسی کوئی چیز ملے تو اُسے تبرک سمجھا جائے مگر ایسی چیز 'ہم نچوڑیں گے دامن' تو ضرور ہے کیونکہ اُس میں ذہانت جھلکتی ہے، 'عیشِ جوانی' صرف جنس زدہ ہی نہیں بلکہ اس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچنے کے لیے جس قدر بے لطف انداز اختیار کیا گیا ہے وہ اقبال کے فطری رجحانات سے کسی زمانے میں بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ گیان چند کی دوسری دلیل یہ ہے، ''عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا لیکن اقبال نے اپنی کئی نظموں میں ایسا کیا ہے مثلاً 'شمعِ زندگانی' میں۔ یہی ہیئت دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' کی ہے۔'' یہ دلیل کافی نہیں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دو نظموں کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے یعنی 'شمعِ زندگانی' اور 'گلِ خزاں دیدہ' خود اُن دونوں کے اقبال کی نظمیں ہونے کی سند نہیں ہے۔ تیسری دلیل ہے، ''آخری شعر میں 'خندۂ گل' کا موضوع بھی اقبال پن لیے ہوئے ہے'' مگر بلبل کے کاروبار پر خندہ ہائے گل تو غالب کے یہاں بھی ہیں۔

اِس نظم کا قدیم ترین ماخذ جو مولف کو بالواسطہ دستیاب ہوا وہ نیچرل شاعری ہے جو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان کسی وقت لکھنو سے شائع ہوئی۔ اس کے مرتب صفدر مرزاپوری کی بے توجہی کا اندازہ گیان چند کی اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے، ''اِس میں ڈاکٹر اقبال ایم اے اور مسٹر اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کے نام سے حسبِ ذیل نظمیں شامل ہیں...'' گویا کتاب میں ایک ہی شاعر کا نام الگ الگ جگہوں پر الگ الگ

اعزازات کے ساتھ درج ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں جگہ غلط یعنی ''ڈاکٹر اقبال ایم اے'' جبکہ کسی نے صرف ایم اے کیا ہو تو وہ ڈاکٹر کیسے کہلائے گا اور ''مسٹر اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا'' تاریخی اعتبار سے غلط کیونکہ اقبال بیرسٹر بننے سے پہلے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ جس مرتب کی بے توجہی کا یہ حال ہو اُس کی سَنَد پر ایک بالکل نئی نظم کو اقبال سے کیونکر منسوب کر لیا جائے۔

دوسری نظم 'گلِ خزاں دیدہ' میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ایک پھول کی زبان سے کھینچا گیا ہے جو کبھی جوان تھا اور اَب نہیں ہے۔ بظاہر یہ نظم اُسی شاعر نے لکھی ہو گی جس نے 'عیشِ جوانی' لکھی تھی اور کسی سند کے بغیر اِس شاعر کو اقبال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم بھی صفدر مرزا پوری کے مجموعے نیچرل شاعری سے لی گئی ہے جہاں اِس کا ماخذ درج نہیں کیا گیا۔

تیسری نظم 'شمعِ زندگانی' کے بارے میں گیان چند خود لکھتے ہیں، ''یہ نظم محض باقیات [یعنی باقیاتِ اقبال] طبع سوم میں ص ۲۲۹م ۲۲۸ پر ہے۔ مرتب نے اس کا ماخذ نہیں دیا تا کہ اقبال سے اس کے انتساب کے بارے میں مزید یقین ہو جاتا۔ ویسے شمع سے خطاب کرنا اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ اس نظم میں شاعر موت آنے پر گڑگڑا کر کہہ رہا ہے کہ چندے اور دُنیا میں رہنے دے۔ یہ خیال اقبال کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کی ذہنی افتاد کے پیشِ نظر یہ ابتدائی دَور ہی کی ہو سکتی ہے۔'' میرے خیال میں یہ اقبال کے کسی دَور کی بھی نہیں ہو سکتی اور شمع سے خطاب کرنا اقبال ہی کو نہیں اکثر شعرا کو مرغوب تھا مگر جس نوعیت کا یہ خطاب ہے وہ اقبال سے بعید ہے۔ ویسے اِس میں خطاب شمع سے نہیں بلکہ 'شمعِ زندگانی' سے ہے اور اقبال نے زندگی کو عموماً شمع نہیں بلکہ شرار یا شعلے سے تشبیہ دی ہے۔ ان دونوں باتوں میں لطیف فرق ہے۔

گیان چند نے اسماعیل میرٹھی کی نظم 'شمعِ ہستی' کو بھی اقبال کی سمجھ لیا اور شاید اِسی وجہ سے تامل کے باوجود اِس نظم کے بارے میں بھی باقیاتِ اقبال کا دعویٰ تسلیم کر بیٹھے۔ [اقبال: اِبتدائی دَور، ص ۱۰۷-۱۰۶]

## ایک قلبی واردات

مئی ۱۹۰۲ء میں شیخ عبدالقادر کا مضمون 'اقبال' شائع ہوا جو محمد دین فوق کے لکھے ہوئے ایک شذرے کے سوا اقبال کے بارے میں پہلی سوانحی تحریر سمجھا گیا ہے۔ اس میں اقبال کی پہلی شادی کے حوالے سے درج ہے، ''چونکہ یہاں رشتہ داریاں نوعمر لڑکوں کی استرضا کے بغیر ہی کر دی جاتی ہیں اِس لیے شیخ محمد اقبال باعتبار شادی بہت خوش قسمت ثابت نہ ہوئے اور اِس واقعے نے طبیعت کی بشاشی اور شگفتگی کو اُداسی سے بدل دیا۔'' شیخ عبدالقادر جیسے قریبی دوست نے یہ بات اقبال کی اجازت کے بغیر نہ لکھی ہو گی لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء تک اقبال کے اپنی پہلی بیوی سے اختلافات کم از کم اتنے تلخ ضرور ہو گئے تھے کہ انھوں نے ایک قریبی دوست کو مضمون میں ان کا تذکرہ کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ بیزاری بعد میں یورپ کی بیباک فضا میں سانس لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

میں نے اس بات کا ذکر *Iqbal: An Illustrated Biography* (2006) میں بھی کیا تھا مگر مضمون کے اگلے ہی جملے میں شیخ عبدالقادر نے جو بات لکھی ہے اُس کی طرف اُس وقت میری توجہ نہیں گئی تھی۔ انھوں نے لکھا، ''اُنہیں ایام میں ایک پیارے دوست کے انتقال نے غم کی آگ پر اور تیل ڈال دیا اور طبیعت کا رنج اشعار سے ٹپکنے لگا اور اُس درد نے شاعری کا وہ حصہ عطا کر کے جسے گداز کہتے ہیں اقبال کو پورا شاعر بنا دیا۔ ہندوستان میں شاعری کی ستۂ ضروریہ میں لاگ یا لگاؤ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حالی جیسے متین شاعر نے اِسے ''چیز وہ مضمون سجھانے والی'' لکھا ہے اور دیگر اساتذہ نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کیا ہے اور اس سے کلام میں واقفیت اور جوش کی چاشنی پیدا کی ہے جس کے بغیر کلام پھیکا رہ جاتا ہے۔ ہمارے اقبال بھی اِس سے خالی نہ رہے۔ کسی کی شوخی کے قائل ہوئے اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں اور بہت سے معاملے کے اشعار نکلنے لگے۔''

یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱- وہ دوست کون تھا جو اقبال کی پہلی شادی کے دنوں میں یعنی ۱۸۹۳ء میں میٹرک کے فوراً بعد کے زمانے میں فوت ہوا اور جس کے غم نے اقبال کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا؟

۲- اقبال جس کی ''شوخی کے قائل ہوئے'' اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں کیا وہ یہی شخصیت تھی اور یہ اُس کی موت سے پہلے کا معاملہ ہے یا اُس کے بعد کسی اور کی طرف اشارہ ہے؟

سیاق و سباق پر غور کر کے میں صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکا ہوں:

یہ کسی ایسے واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ اقبال کے کسی اور سوانح نگار نے نہیں کیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دوستی نہیں بلکہ محبت کی بات ہے جس کی ایک تعبیر یوں سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اقبال کی مرضی کے خلاف اُن کی شادی ہوئی تو اِس صدمے نے کسی محبوب کی جان لے لی مگر کسی تفصیل کے بغیر صرف قیاس آرائی ہی ممکن ہے۔ [اقبال: اِبتدائی دَور، ص ۹۵]

شیخ عبدالقادر کا مضمون اقبال جادوگر ہندی نژاد (۱۹۷۵) سے لے کر اقبالیات کے سو سال میں شامل کیا گیا۔ میرا ماخذ بھی یہی موخر الذکر کتاب ہے اور وہاں سے میں نے پورا مضمون اپنی کتاب میں ص ۲۲۸-۲۲۱ پر بھی شامل کیا ہے اور اس میں دی ہوئی معلومات سے ان کے متعلقہ ادوار میں بھی انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

## کلامِ اقبال پر غالب کے اثرات

بانگِ درا کے دیباچے میں شیخ عبدالقادر نے لکھا کہ اگر وہ تناسخ کے قائل ہوتے تو سمجھتے کہ مرزا غالب کی روح نے اُردو کی ترقی کے لیے اقبال کی صورت میں دوبارہ جنم لیا۔ ماہرینِ اقبالیات عموماً اِسی

دائرے میں رہتے ہوئے دونوں شاعروں کے اُردو کلام کے موازنے تک محدود رہے اور میں نے بھی دمادم رواں ہے یم زندگی میں اگرچہ اقبال کی ابتدائی زندگی میں غالب کے اثرات کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی مگر وہ اِسی دائرے میں تھی۔ غالب کے فارسی کلام بالخصوص اُن کی مثنویات کی روشنی میں بعض نئے پہلو توجہ کے لائق محسوس ہوتے ہیں۔

غالب کی فارسی مثنویاں گیارہ ہیں۔ ان میں سے پہلی 'سرمہ بینش' مولانا روم کی مثنوی کے پہلے شعر سے شروع ہوتی ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
و از جدائی ھا شکایت می کند

اس کے بعد غالب کہتے ہیں کہ وہ خود نہیں کہہ رہے بلکہ کسی کے فیض سے بیان کر رہے ہیں:

من نیم کز خود حکایت می کنم
از دمِ مردے روایت می کنم
از دمِ فیضے کز اُستاد آورم
خامہ را چوں نے برفیاد آورم

ظاہر ہے کہ یہ شخص مولانا روم ہیں۔ بقیہ مثنوی بہادر شاہ ظفر کا قصیدہ ہے مگر یہ تاریخی بہادر شاہ سے زیادہ غالب کے تخیل کا مثالی بادشاہ معلوم ہوتا ہے جس میں فقر اور سلطانی کے اوصاف جمع ہیں۔ اسلامی ادبیات میں بادشاہت کا یہ تصور پہلے سے موجود تھا، قصہ چہار درویش جو امیر خسرو سے منسوب ہے اُس میں بھی پیش کیا گیا تھا مگر غالب کے بچپن کے زمانے میں میر امن دہلوی نے اسے باغ و بہار (۱۸۰۴) کی صورت میں اُردو میں منتقل کر کے ایک نئی زندگی دے دی تھی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ نہ صرف فقر و درویشی کا یہ امتزاج اقبال کے یہاں ایک مستقل موضوع بنا بلکہ اُن کی اپنی پہلی فارسی مثنوی اسرار و رموز بھی بالکل مرزا غالب کی پہلی مثنوی کی طرح مولانا روم کے تتبع کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس کے آغاز میں دیوان شمس تبریز کے اشعار نقل کیے گئے اور تمہید میں کہا کہ مولانا روم کے حکم پر اُنہی کے پیغام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ جس شعر میں یہ بات کہی وہ بھی غالب کے ''از دمِ فیضے'' والے شعر کی تلمیح معلوم ہوتا ہے جو اوپر درج کیا گیا۔ اقبال کہتے ہیں:

باز بر خوانم ز فیضِ پیر روم
دفترِ سربستہ اسرارِ علوم

میں نے غالب کی تیسری مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

تیسری 'چراغِ دیر' میں بنارس کا احوال بیان ہوا تھا جو غالب کے تخیل میں آباد کسی دنیائے کامل کا نقشہ بھی ہو سکتا تھا: ''اِن رُوحوں کو دیکھو جن پر تن کا خول نہیں ہے۔ یہ وہ رُوپ ہے جسے آب و خاک سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی فطرت پھول کی خوشبو کی طرح ہلکی پھلکی ہے، یہ لوگ جان ہی جان ہیں، جسم حائل نہیں!''

[اقبال: اِبتدائی دَور، ص۸۴]

امید ہے کہ قارئین خود ہی اندازہ لگالیں گے کہ اقبال کے شاہکار جاوید نامہ میں فلکِ مریخ پر پیش کی گئی دنیا اور اُس کے رہنے والوں کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں اُن کا اِس مثنوی سے کتنا گہرا تعلق بنتا ہے۔

چوتھی مثنوی 'رنگ و بو' میں ایک بادشاہ کی حکایت کے ذریعے ہمت کو سب سے بڑی قدر بتایا گیا ہے۔ اس کا یہ شعر قابلِ غور ہے:

ہمت اگر بال کشائے کند
صعوہ تواند کہ ہمائے کند

غالب کہہ رہے ہیں کہ ہمت اپنے پر کھولے تو ممولے کو ہما کا مقام مل جائے۔ اقبال کے 'ساقی نامہ' کا یہ شعر فوراً ذہن میں آتا ہے:

اُٹھا ساقیا پردہ اِس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

میں نے چھٹی مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

چھٹی مثنوی 'بیانِ نموداری شانِ نبوت و ولایت' میں نورِ محمدیؐ کا بیان تھا کہ احمد میں سے م نکال دیا جائے تو احد بن جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کا بے مثال ہونا اسی سے ثابت ہے کہ آپؐ خاتم الانبیاؑ ہیں اور ظاہر ہے کہ آخری نبی دو نہیں ہو سکتے۔ یہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب دہلی میں یہ بحث چھڑی تھی کہ کیا خدا آنحضرتؐ جیسا دوسرا بنانے پر قدرت رکھتا ہے؟ غالب کی مثنوی یہ پیغام دیتی تھی کہ اول تو اس نکتے سے بہتر نکتہ یہ ہے کہ خدا جتنی دنیائیں چاہے بنا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر دنیا کا ایک ایک رحمۃ للعالمین بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد غالب نے کہا تھا کہ اس کے باوجود آخری نبی ایک ہی رہے گا جو آنحضرتؐ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

[اقبال: اِبتدائی دَور، ص۸۴]

اقبال کی ابتدائی شاعری اور خاص طور پر متروک منظومات میں تو اِس مثنوی کے مضامین کثرت سے دہرائے ہی گئے مگر جاوید نامہ میں فلکِ مشتری پر جب غالب کی روح ظاہر ہوتی ہے تو اقبال نے نہ صرف اُن سے اِس مثنوی کے بارے میں سوال پوچھے بلکہ اس مکالمے میں حلاج کو بھی شامل کر کے مثنوی کی تشریح حلاج کے ذریعے کروائی۔

غالب کی گیارہویں مثنوی کا عنوان 'ابرِ گہر بار' ہے۔ سب سے پہلے یہی بات قابلِ توجہ ہے کہ اقبال

نے ۱۹۰۳ء میں اپنے ابتدائی زمانے کی اہم ترین نظم کے لیے یہی عنوان پسند کیا: 'ابر گہر بار یعنی نعتِ عاشقانۂ جنابِ سرور کائنات و فریادِ اُمّت برآستانۂ آں ذاتِ بابرکات۔' سمجھا جا سکتا ہے کہ اس عنوان کا مقصد یہی تھا کہ غالب کی اُس مثنوی کی طرف تلمیح ہو جائے جو نہ صرف غالب کی پوری فکر کا خلاصہ ہے بلکہ اس کا ایک حصہ معراج نامے پر بھی مشتمل ہے۔ پھر کیوں نہ سمجھا جائے کہ جاوید نامہ کے ماخذوں میں سب سے اہم ماخذ غالب کی یہی مثنوی تھی؟ اس کے معراج نامے والے حصے میں غالب نے جہاں دیدار کی کیفیت بیان کی ہے وہ اُس سے بہت مماثل ہے جو اقبال نے جاوید نامہ میں بیان کی۔

غالب کا بیان کچھ یوں ہے:

در آنجا کہ از روئے فرہنگ ورائے
بجا باشد را خود نگویند جائے

جہت را دم خودنمائی نمانند
زمان و مکاں را روائی نمانند

غبار از نظر شد ز رہ ناپدید
سراپائے بینندہ شد جملہ دید
در آورد بے کلفت سمت و سوئے
بنور السمٰوات و الارض روئے

تماشا ہلاکِ جمالِ بسیط
فروغِ نظر موجۂ زاں محیط
شنیدن شہیدِ کلامی شگرف
منزہ ز آمیزشِ صوت و حرف

کلامے بی نیرنگے ذات علم
شنیدن بہ عقل اندر اثبات علم

ظ-انصاری نے غالب کی فارسی مثنویوں کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے جس میں متعلقہ اشعار کا ترجمہ لفظی ترمیم کے ساتھ میں نے اپنی کتاب میں یوں شامل کیا ہے:

یہ وہ مقام تھا کہ از روئے عقل اس کو جگہ نہیں کہہ سکتے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں سمتوں کا تعین ہی نہ رہا، وقت اور جگہ کا وجود بے معنی ہو گیا۔

درمیان سے نظر کا غبار فنا ہوا اور دیکھنے والا ہمہ تن دید ہو گیا۔
بغیر سمت اور رخ کے آنخضرت آسمانوں اور زمین کے نور کی طرف متوجہ ہوئے،
جمالِ بسیط نے دیکھنے کو فنا کر دیا، خود اس ذات کی موج نظر کی روشنی ہو گئی!
یہاں سننے کی قوت عجیب کلام نے فنا کر دی، اس کلام میں نہ حرف تھے نہ آواز!
ذاتِ علم کی بے رنگی اس کلام میں تھی جیسے عقل سے کسی حقیقت کا ادراک کہ اس میں سننے کو دخل نہیں!

اقبال نے جاوید نامہ میں دیدار کے مقام کو جس طرح بیان کیا اُس کی غالب کے بیان کے ساتھ مماثلت صاف ظاہر ہے:

غرق بودم در تماشاے جمال
ہر زماں در انقلاب و لایزال

گم شدم اندر ضمیر کائنات
چون رباب آمد بچشم من حیات

آنکہ ہر تارش رباب دیگرے
ہر نوا از دیگرے خونیں ترے

ما ہمہ یک دودمان نار و نور
آدم و مہر و مہ و جبریل و حور

پیش جاں آئینۂ آویختند
حیرتے را با یقیں آمیختند

صبح امروزے کہ نورش ظاہر است
در حضورش دوش و فردا حاضر است

حق ہویدا با ہمہ اسرار خویش
با نگاہ من کند دیدار خویش

دیدنش افزودن بے کاستن
دیدنش از قبر تن برخاستن

عبد و مولا در کمین یک دگر
ہر دو بے تاب اند از ذوق نظر

زندگی ہر جا کہ باشد جستجوست
حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

جناب احمد جاوید نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

میں (اس) جمال کی دید میں غرق تھا
(جو) ہر پل منقلب مگر اٹل
میں کائنات میں باطن میں محو ہو گیا تھا
مجھے زندگی رباب کی طرح دکھائی دی
وہ جس کا ہر تار ایک نیا رباب تھا
اس کا ہر نغمہ دوسرے سے زیادہ لہو برسانے والا تھا
ہم سب آگ اور نور کا ایک خاندان ہیں
آدم، سورج، چاند، جبریل اور حور
روح کے آگے آئینہ سا لٹکا دیا گیا
حیرت کو یقین کے ساتھ گوندھ دیا گیا
آج کی صبح جس کا نور ظاہر ہے
اس کے حضور میں حاضر ہیں ماضی اور مستقبل
حق اپنے سب اسرار سمیت ظاہر
میری آنکھ سے خود کو دیکھ رہا ہے
اس کی دید ایک چڑھاؤ ہے بے اتار
اس کی دید تن کی قبر سے اٹھ کھڑا ہونا ہے
بندہ اور مولا دونوں ایک دوسرے کی گھات میں ہیں
دونوں ذوق نظر کے ہاتھوں بے تاب ہیں
زندگی جہاں بھی ہو، جستجو (سے عبارت) ہے
یہ نکتہ حل نہیں ہوا کہ شکار میں ہوں کہ وہ!

یہ بات بھی چونکانے والی ہے کہ بانگِ درا کی ترکیب جو اقبال کی نظموں میں بار بار استعمال ہوئی یہاں تک کہ ان کے مجموعے کا عنوان بنی وہ جب پہلی دفعہ ۱۹۰۲ء میں متروک نظم 'اسلامیہ کالج کا خطاب

پنجاب کے مسلمانوں سے'میں استعمال ہوئی تو غالب کے پیغام کے تسلسل کی طرف اشارہ کر رہی تھی:

ہے سوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

غالب نے صریرِ خامہ کو نوائے سروش یعنی غیب سے مضامیں لانے والے فرشتے کی آواز کہا تھا۔ اقبال اسی صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے والے تھے۔''نوائے سروش نے منزل کا پتہ دیا تھا،'' میں ص ۲۰۸ پر لکھا ہے۔بانگِ درا منزل کی طرف بڑھنے کا اعلان کرنے والی تھی۔'' (بعد میں مثنوی اسرارِ خودی لکھی تو پہلے اُس کا عنوان بھی 'نوائے سروش' ہی تجویز کیا جو بظاہر غالب ہی سے ماخوذ تھا)۔

## اقبال اور قرآن

''کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا،'' اقبال کا بیان ہے۔''میرا معمول تھا ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اِس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے...وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا... کہنے لگے،تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے اُن کے سوال پر بہت تعجب ہوا۔ بہرحال، میں نے مؤدبانہ عرض کیا،قرآن پاک۔ کہنے لگے،تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا کیوں نہیں،تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اُنھوں نے میرا جواب نہایت خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا...کچھ دن گزر گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔لیکن اِس واقعے کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے ... والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو اُنھوں نے مجھے بلایا اور پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے،''بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر نزول ہو...کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ وپے میں سرایت کر جائے گی۔''

یہ واقعہ سید نذیر نیازی نے اقبال سے سن کر اقبال کے حضور میں شامل کیا جہاں سے یہ کافی مشہور ہوا ہے۔ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے عام طور پر اِس واقعے سے واقف ہوتے ہیں مگر تشکیل جدید (انگریزی) پر پروفیسر محمد سعید کے لکھے ہوئے حواشی میں یہ بات مزید کھل کر سامنے آئی کہ اپنی سب سے اہم فلسفیانہ تصنیف کے آخری خطبے میں اقبال نے جس ''صوفی'' کا قول نام لیے بغیر دہرایا اور ایک طرح سے اُسے خطبے کا بنیادی موضوع بنایا ہے وہ دراصل اقبال کے والد ہیں اور قول بھی وہی نصیحت ہے جو انھوں نے اس موقع پر کی تھی۔

اِس کے ساتھ دوسری باتیں بھی ذہن میں رکھنی چاہئیں، مثلاً اسرار و رموز کے آخر میں اپنے کلام کے بارے میں کہنا کہ اس میں قرآن کے سوا کچھ نہیں، اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے موقع پر انگلستان کے دانشوروں سے اصرار کرنا کہ یہ مثنوی نیٹشے نہیں بلکہ قرآن سے ماخوذ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اقبال کی ذہنی سرگذشت کا اصل موضوع قرآن تھا۔ شروع ہی سے یہ بات محسوس کی گئی اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا جس میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ضخیم کتاب اقبال اور قرآن شامل ہے۔ ان کتابوں کی وجہ سے سوانح نگاروں کو بھی کم سے کم اِتنا ضرور کہنا پڑا کہ اقبال اور قرآن میں کچھ تعلق تھا مگر یہ کہنے کے باوجود بہت سے سوانح نگاروں نے عملاً پوری سوانح کی اُٹھان کچھ اِس طرح رکھی جیسے اقبال یکے بعد دیگرے بہت سے مغربی فلسفیوں کے رد و قبول کے مراحل سے گزرتے جا رہے ہیں مگر تحصیلِ حاصل کے سوا کچھ اور مقصد نہیں۔ یہ ذہنی سرگذشت 'میبل اور میں' کے ہیرو کی ہو سکتی ہے، اقبال کی نہیں۔

۱۹۰۴ء تک کے واقعات پر ختم ہونے والی سوانح میں ممکن نہیں کہ اِس بحث کو تکمیل تک پہنچا کر اِس کے تمام مضمرات واضح کر دیے جائیں مگر امید ہے کہ قارئین محسوس کر لیں گے کہ اس کتاب میں اقبال کی سوانح کا اصل رُخ یہی ہے۔ آئندہ اَدوار میں یہ بات مزید واضح ہوتی جائے گی۔

## قوم اور وطن

اقبالیات میں یہ مفروضہ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اقبال پہلے وطنیت کے قائل تھے اور بعد میں قوم کو اہمیت دینے لگے۔ اس سلسلے میں اقبال کے بعض خطوط سے بھی حوالے دیے جاتے ہیں اور سب سے بڑی مثال یہ دی جاتی ہے کہ پہلے انھوں نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور بعد میں ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہا۔ اپنی جگہ یہ تمام شواہد درست ہیں مگر ان سے جو مجموعی صورت حال برآمد کی جاتی ہے وہ کس حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ جب اِس بات پر غور کیا جائے کہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں جب ترانۂ ہندی پہلی بار 'ہمارا دیس' کے عنوان سے شائع ہوا تو اُسی شمارے میں 'قومی زندگی' کے عنوان سے اقبال کا ایک مضمون بھی شامل تھا جس میں قوم سے ہندوستانی نہیں بلکہ ہندوستان کی مسلمان قوم مراد لی گئی تھی!

تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ ہندوستان وطن ہے جس میں کئی قومیں آباد ہیں۔ یہی موقف ترانۂ ہندی میں ہے اور یہی 'طلوعِ اسلام'، خطبہ الٰہ آباد اور اے اقوامِ شرق (پس چہ باید کرد) میں دہرائے جاتے ہوئے آخر تک قائم رہا۔ اصل تبدیلی کچھ اور تھی جسے سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہندوستانی وطنیت کے بارے میں اقبال کا موقف دراصل وہی تھا جو صدیوں

سے ہندوستان میں رائج تھا اور جسے سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر اور خود اقبال نے نئے زمانے میں بڑی دیانتداری کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی یعنی ہندوستان کئی قوموں کا وطن ہے جن کی جداگانہ شناخت کو تحفظ ملنا چاہیے کیونکہ اس قومیت کی بنیاد مذہبی تجربے پر ہوتی ہے یعنی یہ کسی نہ کسی پیغمبر کے روحانی مشاہدات کی یادگار ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے ایک دفعہ کہا تھا، ہندوستان ایک ملک نہیں ہے مگر اِسے ایک بنانے کی ضرورت ہے۔

دوسرا تصور نیا تھا جسے کانگریس ۱۸۸۵ء کے بعد سے رائج کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ مغربی تعلیم حاصل کرنے والے چند نوجوانوں کا نظریہ تھا جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر اتفاق سے ہندو انتہا پسندی کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ ہو گیا خواہ دانستہ یا نادانستگی میں ہوا ہو۔ اس تصور میں سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ اسے حقیقت سے واسطہ نہ تھا:

> مغربی ادب سے اُنیسویں صدی کے شروع کی رومانویت اور اواخر کا انحطاط لے کر اُس بنگالی ادب کا خمیر تیار ہوا جس میں ہندوستان کو انگلستان اور فرانس کی طرز پر ایک ریاست سمجھا گیا تھا۔
>
> مغربی تہذیب میں امریکہ ایک ایسا عنصر تھا جو روایات کے پھندوں سے آزاد تھا اور اسے اقبال نے اُس وقت دریافت کیا تھا جب بنگال کے کولمبس بحرِ ظلمات کے پار نہیں پہنچے تھے۔ ایمرسن کی نظم سے ماخوذ 'ایک پہاڑ اور گلہری' غالباً اقبال پہلے ہی لکھ چکے تھے مگر اب امریکی صوفی کی ایک اور نظم نے اُن کی توجہ کھینچی۔ 'گڈ بائے' میں ایمرسن نے دنیا کو خدا حافظ کہہ کر عدم کی طرف سفر کرنے کی بجائے فطرت کی طرف رجوع کیا تھا اور اُس کے لیے فطرت غفلت اور فرار کی بجائے آگہی کا ذریعہ بن گئی تھی۔
>
> 'رخصت اے بزمِ جہاں' ستائیس اشعار کی نظم تھی۔ اِس کی ہیئت مثنوی کی تھی۔ پہلے بند میں بارہ، دوسرے میں چھ اور تیسرے میں نو شعر تھے:
>
> علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اُس کی نمود
> گل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بُود
>
> یہ بنگالی ادب اور اُس سے پیدا ہونے والے تصورات پر بڑی لطیف تنقید تھی۔ فروری میں دکن ریویو میں شائع ہوئی۔ شیخ عبدالقادر نے مخزن کے لیے کوئی نظم طلب کی تو اقبال نے کچھ ترمیم کے ساتھ یہی نظم دے دی...
>
> [اقبال: ابتدائی دَور، ص۲۹۳]

اُس زمانے کی صرف چند نظمیں ہی نہیں بلکہ اقبال کی ابتدائی زندگی کی پوری اُٹھان انہی بنیادوں پر دکھائی دیتی ہے بشرطیکہ پہلے سے قائم کیے ہوئے مفروضوں کی روشنی میں صرف چند حقائق منتخب نہ کیے جائیں بلکہ چھوٹی سے چھوٹی ہر تفصیل سامنے رکھ کر ایسی تصویر بنانے کی کوشش کی جائے جو پورے منظر کے ساتھ انصاف کرتی ہو۔ میں نے تمام جزئیات یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور اُمید ہے کہ اُن کی روشنی میں

قارئین کو خود بھی کسی فیصلے پر پہنچنے میں سہولت ہو گی۔

اس کے باوجود یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ قوم کے بارے میں اقبال کسی نہ کسی قسم کے تجربے سے دوچار ضرور ہوئے۔ میرے خیال میں اس تجربے کی حقیقت بہت پہلے ہمارے سامنے آ گئی ہوتی اگر ہم اقبال کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بھی شاعر، فلسفی، وطن پرست اور ملت پرست کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے اس کی زندہ توانائی کو نظر انداز نہ کر بیٹھے ہوتے:

۱- ۱۸۷۳ء میں سرسید احمد خاں نے اپنے مضمون یا افسانے 'گزرا ہوا زمانہ' میں نوجوانوں کو ایک دلہن کی جھلک دکھا کر اُس سے محبت کرنے کا درس دیا۔ اس دلہن کا نام ''تمام انسانوں کی روح'' تھا۔ نہ صرف عام اسلامی ادبیات بلکہ اس افسانے سے صرف تین برس قبل لکھے جانے والے خود سرسید کے خطباتِ احمدیہ کے دیباچے کی روشنی میں یہ تمام انسانوں کی روح مسلمانوں کی وہ اجتماعی خودی تھی جسے بعض حکیموں نے انسانِ کامل کا نام دیا تھا۔

۲- یہ محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا کہ سرسید کے خاص پیروکار مولوی سید میر حسن کی نگرانی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اقبال نے تحقیق کا آغاز کیا تو سب سے پہلے عبدالکریم الجیلی کے اُس رسالے کو موضوع بنایا جس کا عنوان ہی الانسان الکامل تھا۔

۳- اس تعلیمی سفر کے صرف آخری مراحل میں انہیں آرنلڈ کی نگرانی بھی میسر آئی جس کے زیرِ اثر اُنھوں نے الانسان الکامل سے شروع ہونے والی تحقیق کو مزید پھیلانے کے لیے کیمبرج اور جرمنی کا سفر اختیار کیا۔ ایک دفعہ پھر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اقبال نے اپنی اعلیٰ تحقیق کے بارے میں مولوی سید میر حسن سے مشورے کیے۔

۴- یہ تحقیق ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقا میں بدل گئی مگر اِس کے ساتھ ہی یورپ میں قیام کے دوران اقبال اعلان کر رہے تھے کہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

جسے وطن پرستی سے قوم پرستی کی طرف مراجعت سمجھا گیا ہے دراصل وہ غیب اور حضور کا فرق تھا۔ اقبال کو اُس اجتماعی خودی کی جستجو تھی جس کی ایک جھلک سرسید دکھا کر اُسے اُس عہد کے سب نوجوانوں کے

خیالوں میں بسا گئے تھے۔ 'مارچ ۱۹۰۷' وہ نیا موڑ تھا جب یہ حقیقت اِس طرح سامنے آئی کہ جستجو کے مراحل ختم ہو گئے اور صرف اپنے مجازی وجود کو فنا کر کے اُس حقیقت کو اپنانے کی ضرورت رہ گئی۔ غیب سے حضور کا یہ فاصلہ صرف لاہور سے کیمبرج سفر کر کے طے نہیں ہو گیا بلکہ اس میں اُس زمانے کے مسلمان معاشرے کے اجتماعی تجربات بھی شامل تھے جن سے اقبال روحانی، فکری اور جذباتی طور پر جڑے ہوئے تھے۔

مسلمان قومیت سے وابستہ ہونے کا احساس ایک غیر متوقع طور پر ملکہ وکٹوریہ کے مرثیے 'اشکِ خوں' (۱۹۰۱ء) میں ظاہر ہوتا ہے۔ چند برس پہلے ملکہ کی گولڈن جوبلی پر سپاسنامے پیش ہو رہے تھے تو مسلمانوں نے علیحدہ بھی پیش کیے تھے اور ایسے ہی ایک سپاسنامے کی تجویز پر سید میر حسن نے تقریر بھی کی تھی جس کے اقتباس میں نے کتاب میں شامل کیے ہیں۔ اقبال کے مرثیے میں ہندوستان ایک وطن اور مسلمان ایک قوم کے طور پر موجود ہیں۔ ''مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو'' خالص مسلمانوں کا اظہارِ تعزیت ہے:

> ملکہ وکٹوریہ کا انتقال عید کے دن ہوا چنانچہ اقبال نے ہلالِ عید سے خطاب کر کے ایک طرف اُسے وہ خاص تعلق یاد دلایا جو اُسے اُن کی قوم کے ساتھ تھا مثلاً مسلمانوں کا قومی نشان تھا...ایک اچھے حکمراں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اقبال نے وہ بنیادی خصوصیات گنوا دیں جو اُن کے خیال میں اور شبلی نعمانی کے حساب سے مسلمان بادشاہوں میں ہوا کرتی تھیں:
>
> فرماں نہ ہو دِلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
> سونے کا تاج کوئی نشانِ شہی نہیں
>
> تعزیت کے موقع پر اِن خصوصیات کو اعزازی طور پر ملکہ وکٹوریہ سے منسوب کر دینے سے ظاہر تھا کہ تعزیت کرنے والی قوم خود بھی آدابِ جہانبانی سے ناواقف نہیں ہے:
>
> شاہی یہ ہے کہ اور کا غم چشمِ تر میں ہو
> شاہنشہی پہ شانِ غریبی نظر میں ہو
>
> یہ کہنا مشکل ہے کہ ملکہ وکٹوریہ میں یہ تمام خوبیاں موجود رہی تھیں مگر اقبال کے اپنے تخیل کی ایک گرہ ضرور کھل رہی تھی۔ فقر اور شاہی کے امتزاج کی پہلی جھلک یہیں دکھائی دیتی ہے۔
>
> [اقبال: اِبتدائی دَور، ص۱۸۷-۱۸۵]

البتہ یہ بھی درست ہے کہ اِس سے پہلے اقبال عام طور پر کشمیر کو جنت اور گلشن کہا کرتے تھے مگر یہاں پہلی بار ہندوستان کے لیے باغ کا لفظ ملتا ہے جو بعد میں 'ترانۂ ہندی' میں اپنے عروج کو پہنچا۔ چنانچہ 'اشکِ خوں' یعنی وکٹوریہ کا مرثیہ ایک اور مثال ایسی نظم کی ہے جہاں ہندوستان کو اِس شرط پر وطن تسلیم کیا جا رہا ہے کہ قومیت کی بنیاد اسلام ہی رہے گا۔

اس کے اگلے برس انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اقبال نے 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' پڑھی۔ یہ نظم بھی بانگِ درا میں شامل نہیں۔ وجہ یہ رہی ہو گی کہ اس کے مضامین زیادہ بہتر طور پر دوسری نظموں میں آ گئے۔ سوانح میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہاں ''عشقِ اخوان'' کا تصور واضح طور پر سامنے آیا جو بعد میں تصورِ ملت اور فلسفۂ بے خودی کی اساس بنا۔

نوٹ: سوانحی سلسلے کی دوسری کتاب [اقبال: تشکیلی دَور ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳] تیار ہو چکی ہے۔ اس میں جو نیا مواد اور نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں اُن کا تعارف آیندہ شمارے میں مضمون کی دوسری قسط میں پیش کیا جائے گا۔